Tarseel, Vol.17 (ISSN: 0975-6655)
A Peer Reviewed Research Journal of Urdu
Listed in UGC-CARE
Directorate of Distance education,
University of Kashmir

ذاتی تجربات و محسوسات کا شاعر: جگرؔ مراد آبادی

پروفیسر ابوبکر عباد

تلخیص

اس مضمون میں کوشش کی گئی ہے کہ جگر مراد آبادی کی زندگی کے مخصوص حالات ،اہم معاملات اوران کی شخصیت کے اُن گوشوں کو زیر بحث لایا جائے ،جن سے ان کی نفسیات،ان کے مزاج ،ان کی پسند و ناپسند اوران کے غالب رجحان کو سمجھنے میں مدد مل سکے۔کہ کسی بھی فنکار کے فکر و تصورات کی تشکیل،اس کے فنی اظہار کے نہج کے تعین اورفن پارے کی معیار بندی میں یہ عناصر نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔چونکہ جگر مراد آبادی کے یہاں حسن وعشق اور جذبات واحساسات کی فراوانی ہے اس لیے ہمارے ناقدین انھیں رومانی شاعر کہتے آئے ہیں۔اور ایسا کہنا کوئی غلط بھی نہیں ہے،لیکن یہ بات ذہن نشیں رہنی چاہیے کہ ان کی رومانیت اخترؔ شیرانی اور جوشؔ ملیح آبادی کی رومانیت سے بالکل مختلف ہے۔یوں کہ اخترؔ شیرانی اور جوشؔ ملیح آبادی کی رومانیت کا فی حد تک تصوراتی ہے،یا یوں کہیے کہ انھوں نے رومان کو حقیقت بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے، جب کہ جگرؔ نے حقیقت کو ہی اپنی زبان،اپنے اسلوب اوراپنی فنکاری سے رومانی رنگ و آہنگ عطا کیا ہے۔جگر کے یہاں حسن وعشق، عاشق ومعشوق اور جذبات واحساسات کا اظہار بھی اوروں سے الگ ہے،اور جگ بیتی اور سنی سنائی معلومات کے بجائے ان کی آپ بیتی،ان

کے ذاتی تجربات اور حقیقت کی زمین سے نمو کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ جگر کی زندگی جیسی رنگین، جتنی دلچسپ، پُر کیف اور پُر سوز تھی ویسی ہی ان کی شاعری ہے۔ جگر کی شاعری میں تصوف کے موضوعات بھی دریافت کیے گئے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے یہاں تصوف کے مقابلے سیاست کو کہیں زیادہ دخل ہے، گوکہ ہمارے متعدد ناقدین نے جگر کی شاعری میں سیاست کے موضوع کا انکار کیا ہے، یا اسے قابل اعتنا نہیں جانا۔ مگر جگر کے کلیات کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے اخیر دور میں سیاست کو دانستہ اپنی شاعری کا موضوع بنایا، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سیاست اور سیاسی موضوعات سے متعلق خاصی معلومات اور بصیرت رکھتے تھے۔ حسن وعشق اور سیاست کے ساتھ جگر کی شاعری میں خمریات کے موضوع کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ حسن، عشق، شاعری اور شراب سے ہی جگر کی شخصیت تشکیل پاتی ہے اور ترفع حاصل کرتی ہے۔ بسا اوقات تو ان کے یہاں محبوب اور شراب کے فرق کا حد فاصل مٹتا ہوا سا محسوس ہوتا ہے۔ شاید اسی لیے ان کے یہاں شراب کا بیان ایک نوع کی سنجیدگی، شائستگی، احترام اور شدید تجرباتی محسوسات سے معمور ہے۔

کلیدی الفاظ:

حنفی المسلک۔ معاشقے۔ اصغر گونڈوی۔ عیسائی خاتون۔ تحصیلدار۔ طوائف ۔ مشن اسکول۔ عاقل چشمہ فروش ۔ داغ دہلوی۔ حسن و عشق۔ خمریات، شادیاں۔ سیاسی اشعار۔ کلاسکی معیار۔ متصوفانہ عقائد۔ سہل ممتنع۔ تغزل۔ تہذیب و شائستگی۔ فکری اجتہاد۔ سیاسی اشعار۔ وطن پرستی۔ انتقال کی خبریں

جگر مرادآبادی کی شاعری جتنی دل نشیں، جدید اور جداگانہ ہے، ویسی ہی ان کی زندگی بھی دلچسپ، دلسوز، دلکش اور تجسس آمیز مگر کھلی ہوئی کتاب ہے۔ کم لوگوں کو یاد رہ گیا ہے کہ جگر محض آزاد منش، لاپروا اور لاابالی ہی نہیں بلکہ خاصے کنفیوژڈ تھے۔ ان کی تاریخ پیدائش 1890 تھی وہ بعض مواقع پر بتاتے بھی یہی تھے مگر اپنی بیاض میں اسے 1894 لکھا ہے، یہ مرادآباد

میں پیدا ہوئے تھے مگر جائے پیدائش بنارس بتائی، ان کے دادا کی ایک شاخ نے دہلی اور مراد آباد کے درمیان اعظم پور باشہ میں سکونت اختیار کر لی تھی جگر نے اس مقام کو بہار میں بتایا ہے، اپنے والد کے بارے میں لکھا کہ وہ تفضیلی تھے جب کہ وہ پابند صوم و صلوٰۃ کٹر حنفی المسلک اور قادریہ خاندان سے بیعت تھے۔ اکثر اپنی چیزیں کہیں رکھ کر اور لوگوں کو پیسے دے کر بھول جاتے، قرضدار قرض لوٹاتے تو یہ کہہ کر صاف انکار کر دیتے کہ 'جب ہم نے دیے ہی نہیں تو واپس کیسے لے لوں'۔ لیکن یہ سب انھوں نے مرزا غالبؔ اور جوشؔ ملیح آبادی کی طرح کسی کو مرعوب کرنے اور اظہارِ انانیت کے پیش نظر نہیں کیا، انھوں نے کھلے دل سے اعتراف کیا ہے کہ: ''مجھے دن، تاریخ، سنہ، پتے اور مناصب یاد نہیں رہتے، ان باتوں سے مجھے کوئی مناسبت نہیں۔''

(جگر مرادآبادی: حیات اور شاعری، ڈاکٹر محمد اسلام، لکھنؤ، 1966، ص، 55)

جگرؔ عقل سے چڑتے اور وجدان کو دوست رکھتے تھے۔ انھیں کتابوں سے ہمیشہ بیر رہا مگر جاسوسی ناول پڑھنے کا دیوانگی کی حد تک شوق تھا۔ تاش کے رسیا تھے، یوں بھی ہوتا کہ تین چار دنوں تک مسلسل تاش کھیلتے رہ جاتے، رمی سے زیادہ دلچسپی تھی مگر بلیک کوئین اور برج بھی پسند کرتے تھے۔ کبھی کبھار شطرنج اور کیرم بھی کھیلا کرتے تھے۔ چائے کے شوقین تھے، زیادہ پتی کی تیز چائے پیتے تھے۔ سگریٹ کے عادی تھے اور پان پر فریفتہ، پان اور تمباکو کی ڈبیہ سفر میں بھی ساتھ رکھتے تھے۔ ایک طویل عرصے تک انھیں شراب کی لت تھی اور اس درجہ کہ اچھی بری میں کوئی تمیز نہیں کرتے، شراب خالص پیتے اور کثرت سے پیتے تھے، اس کے ساتھ پانی یا سوڈا ملانے کو شرک بتاتے۔ انھوں نے 1941 یا 42 میں ایک ڈاکیومنٹری فلم 'آسمانی مشاعرہ' میں بھی کام کیا تھا۔ اس فلم میں 'زندہ مشاہیر نے گزشتہ مشاہیر کی نمائندگی کی تھی۔ چنانچہ مولوی عبدالحق صاحب نے حالیؔ کا کردار ادا کیا تھا، خواجہ حسن نظامی نے نظیرؔ اکبرآبادی کا، خان بہادر رضا علی وحشتؔ نے مرزا غالبؔ اور جگر مرادآبادی نے داغؔ دہلوی کا۔ بدقسمتی سے اس فلم کا نگیٹیو جل گیا ورنہ ایک اہم یادگار چیز ہوتی۔

(بحوالہ، جگر مرادآبادی: حیات اور شاعری، ص، 108)

جوشؔ ملیح آبادی نے 'یادوں کی برات' میں اپنے ڈیڑھ درجن سے زیادہ معاشقوں کا ذکر کیا ہے جو درحقیقت انھوں نے کبھی کیے ہی نہ تھے، جگرؔ مرادآبادی نے بشمول اپنی بیویوں کے واقعتاً دس محبوباؤں سے دل لگائے مگر سوائے اپنی آخری بیوی نسیم کے، ہر جگہ انھیں ناکامیوں کا منھ دیکھنا پڑا۔ ان کے مطابق انھیں پہلا عشق سات آٹھ سال کی عمر میں اپنے تایا کے کرایہ دار کی بیوی سے ہوا تھا جنھیں وہ پہروں دیکھا کرتے تھے۔ دوسرا بارہ تیرہ سال کی عمر میں تب، جب وہ سامنے سے سر پر گھڑا اور ہاتھ میں بالٹی

لے کر آتی ہوئی دس گیارہ برس کی ایک لڑکی کو دیکھ کر اس پر فدا ہو گئے تھے، اس کے بارے میں لکھتے ہیں: ''اس کے بعد مجھ پر ایک کیفیت طاری ہوگئی جس کا اظہار میں الفاظ میں نہیں کر سکتا۔'' سن بلوغ کو پہنچے تو بڑی عمر کی اپنی ایک عزیزہ سے شدید محبت کر بیٹھے۔ یہ تمام عشق یک طرفہ تھے، بالعموم سامنے والے کو احساس تک نہیں ہوا، یا ہوا تو اسے بچے کا پیار سمجھا گیا۔ چوتھا عشق دوران ملازمت ضلع بجنور میں تحصیلدار صاحب کی بیوی سے ہوا جس کا ذکر قدرے تفصیل سے آگے آئے گا، اس کے بعد ان کی زندگی میں ایک اہم موڑ آیا۔ پانچواں عشق انھوں نے آگرہ میں وحیدن بیگم سے کیا اور شادی بھی انھی سے کی مگر یہ شادی زیادہ دنوں تک نہ چل سکی اور علاحدگی ہوگئی، اس کا ذکر بھی آگے آئے گا۔ تقریباً آٹھ دس سال بعد اصغرؔ گونڈوی نے ان کی دوسری شادی اپنی سالی نسیم سے کروا دی لیکن جگر کی لاپروائی اور لاابالی کی وجہ سے دونوں کی طلاق ہوگئی۔ جن دنوں جگرؔ مین پوری میں جگت موہن لال رواں کی دیکھ بھال میں تھے انھی دنوں وہاں کی ایک ڈیرے دار طوائف سے ان ملاقاتیں رہیں لیکن قریبی تعلقات استوار نہ ہو سکے۔ رائے بریلی کی سرائے میں قیام کے دوران ایک بڑی ہی حسین وجمیل بھٹیارن سے ان کا معاشقہ چلا، اور اناؤ میں نرم و نازک نقشے اور چھریرے بدن والی دو بہنوں سندر مُندر سے بھی۔ یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ ان معاشقوں کو جگرؔ کی شخصیت اور ان کے رویے کے بجائے ان کے احساس جمال اور حسن پسند مزاج سے قائم کر کے دیکھنا چاہیے۔ سوائے ایک کے ان تمام معاشقوں پر نہ تو انھیں کبھی شرمندگی و لجاجت ہوئی، نہ انھوں نے کبھی فخر کیا۔

آیئے اب ان کی زندگی کی مزید تفصیلات بھی جاننے کی کوشش کریں تا کہ ان کی شخصی جہات، نفسیات اور ان سب کے اثرات کے نتیجے میں مرتب ہونے والی ان کی شاعری کے امتیازات کی تفہیم زیادہ آسان ہو سکے۔

جگر کا پورا نام شیخ محمد علی سکندر تھا اور جگرؔ تخلص۔ 6/اپریل 1890 کو مرادآباد کے محلّہ لال باغ میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان حافظوں، مولویوں اور شاعروں کا تھا مورث اعلیٰ مولوی محمد سمیع دلی کے باشندے اور بادشاہ فرخ سیر کے استاذ تھے جو بادشاہ کو حدیث کی تعلیم دینے پر مقرر تھے۔ بعد میں انھوں نے ترک وطن کر کے مرادآباد میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور یہاں بھی حدیث کے درس کا سلسلہ جاری رکھا۔ جگرؔ کے پردادا حافظ محمد نور، دادا حافظ مولوی امجد علی اور والد مولوی محمد نظر سبھی شاعر تھے۔ ان کے علاوہ چچا علی ظفر، تایا مولوی علی اکبر، پھوپھی زاد بھائی اور سگے چھوٹے بھائی علی مظفر بھی شاعر تھے اور دلؔ تخلص کرتے تھے۔ جگر کی والدہ ان کے والد کی دوسری بیوی تھیں۔ یہ ایک عیسائی خاتون تھیں جو مشرف بہ اسلام ہو کر جگرؔ کے والد کی پہلی بیوی کے انتقال کے کئی برس بعد ان کے نکاح میں آئیں تھیں۔ چونکہ یہ مسلم معزز خاندان سے نہ تھیں اس لیے جگرؔ کے خاندان کی

روایت پرست خواتین انھیں پسند نہیں کرتی تھیں اور ان سے کسی طرح کا ربط ضبط بھی نہیں رکھتی تھیں۔ جگر اور ان کے چھوٹے بھائی ابھی کم سن ہی تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا، ایسے میں والدہ سے جو کچھ بن پڑا بچوں کے لیے کرتی رہیں۔ جب جگر کی والدہ کا انتقال ہوا تو رشتے داروں نے انھیں خاندانی قبرستان میں محض اس لیے دفن نہیں ہونے دیا کہ ان کا نسلی تعلق کسی اور خاندان سے تھا۔

جگر نے سات سال کی عمر تک عربی فارسی کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی تھی اور نو سال کی عمر تک مولوی معین الدین صاحب سے۔ یہ زمانہ جگر کے والد کا تنگیوں بھرا تھا اس لیے جگر اپنے چچا علی ظفر جو باندہ میں محکمۂ پولس میں انسپکٹر تھے، کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ علی ظفر نے انھیں وہیں کے انگریزی اسکول میں داخل کرا دیا تھا اور ان کے تعلیمی اخراجات برداشت کرنے کی ذمہ داری قبول کی۔ جب ان کے چچا کا تبادلہ باندہ سے لکھنو ہو گیا تو انھوں نے جگر کا داخلہ لکھنو کے مشن اسکول میں کروا دیا جہاں سے انھوں نے نویں کلاس تک کی انگریزی تعلیم حاصل کی۔ چونکہ انگریزی تعلیم سے جگر کو دلی مناسبت نہ تھی اس لیے وہ اور ان کے دو اور قریبی دوست نویں کلاس میں دوسری بار بھی فیل ہو گئے۔ اسی سال ان کے والد کا انتقال ہو گیا جس کے بعد انھیں اپنا تعلیمی سلسلہ جاری نہ رکھ سکنے کی معقول وجہ ہاتھ آ گئی۔ تب جگر کی عمر محض سولہ برس تھی۔

معاشی کفالت کے لیے جگر کے چچا نے انھیں نجیب آباد میونسپلٹی میں محافظِ دفتر کی ملازمت دلوا دی۔ وہیں پر ان کے چچا کے ایک دوست تحصیلدار صاحب بھی رہتے تھے جنھوں نے ایک طوائف سے شادی کی ہوئی تھی۔ جگر کا ان کے یہاں آنا جانا تھا، رفتہ رفتہ انھیں بھی تحصیلدار صاحب کی بیوی سے محبت ہو گئی، چنانچہ ایک دن انھوں نے ایک خط میں اپنی محبت کا اظہار کر کے خط تحصیلدار صاحب کی بیوی کے حوالے کر دیا، تحصیلدار صاحب کی بیوی نے خط تحصیلدار صاحب کو دے دیا اور تحصیلدار صاحب نے وہ خط ڈاک سے جگر کے چچا علی ظفر صاحب کے پاس بھیج دیا۔ چچا نے جواب میں لکھا کہ وہ جلد ہی ان کے پاس پہنچ رہے ہیں۔ یہ خبر جگر کو معلوم ہوئی تو خودکشی کی نیت سے بہت ساری بھنگ کھا لی، مشکلوں سے انھیں ہوش میں لایا گیا، حالت سنبھلنے کے بعد وہ وہاں سے بھاگ کر آگرہ چلے گئے، وہیں سکونت اختیار کر لی اور مارے شرم کے تمام عمر چچا کا سامنا نہیں کیا۔ آگرے کی مشہور بی۔ این بیجل نام کی چشمہ کمپنی میں ایجنٹ کی حیثیت سے انھوں نے ملازمت حاصل کی اور کچھ عرصے بعد اپنی پسند کی ایک خاتون وحیدن بیگم سے شادی کر لی۔ سال ڈیڑھ سال بعد گھر والوں کو ان کے آگرہ میں قیام کا پتہ چلا تو ان کی والدہ اور ان کے بھائی علی مظفر دونوں میاں بیوی کو اپنے ساتھ مراد آباد لے آئے۔

کچھ عرصے بعد والدہ اور چچا بھی جنت سدھار گئے۔اب ہمدرد وغمخوار بس بیوی وحیدن بیگم اور چھوٹے بھائی علی مظفر رہ گئے تھے۔جگر نے مراد آباد میں ہی وحیدن بیگم کے رشتے کے بھائی محمد عاقل چشمہ فروش کے یہاں ایجنٹ کی حیثیت سے ملازمت کر لی جس کی وجہ سے انھیں اکثر گھر سے باہر رہنا پڑتا تھا۔عاقل کا جگر صاحب کے گھر میں آنا جانا تھا۔رفتہ رفتہ وحیدن بیگم سے اس کی بے تکلفی بڑھی اور مشکوک حد تک جا پہنچی۔ایک بار علی مظفر نے عاقل کو بھابی کے ساتھ ناشائستہ مذاق کرتے دیکھ کر اسے ڈانٹا کہ بھائی کی غیر موجودگی میں گھر نہ آیا کریں،دوسری بار جگر نے وحیدن بیگم کو مشکوک حالت میں دیکھا تو ناراض ہوکر گھر سے جانے کہاں چلے گئے۔وحیدن بیگم نے جگر کا چھ مہینے تک انتظار کرنے کے بعد عاقل سے شادی کر لی۔اس جانکاہ حادثے کا جگر کی زندگی پر شدید اثر ہوا اور وہ گھومتے پھرتے گونڈہ پہنچے جہاں اصغر گونڈوی سے ان کی ملاقات ہوئی۔انھوں نے 1919 میں ہوئی اصغر سے اپنی اس ملاقات کا واقعہ ناطق جے پوری سے اس طرح بیان کیا ہے:

> ’’شاید تمھیں معلوم نہ ہو کہ میں مختلف مذہبی عقائد سے گزرتا رہا ہوں۔ایک زمانہ میں ’دہریت‘ بھی مجھ پر حاوی رہی ہے، میں شیعت کی جانب بھی رجحان رکھتا تھا،ان دنوں میں لاہور میں چشمہ کی ایک فرم میں ملازم تھا،جس کے ڈائرکٹروں میں شیخ عبدالقادر بھی تھے۔یہ زمانہ میرا دکھ اور روحانی اذیتوں کا تھا۔آخر ایک روز میں حضرت اصغر گونڈوی کے پاس ان سے ملنے کے لیے گیا جو ایک صاحب سے بحث کر رہے تھے۔میری دلچسپی نے دور ہی سے مجھے اس بحث کو سننے کے لیے روک لیا۔میں قریب کھڑا ہوا،اس طرح کہ وہ مجھے دیکھ نہ سکیں تمام بحث سنتا رہا۔عجیب بات یہ تھی کہ حضرت اصغر سمجھا رہے تھے اُسے اور میرے دل میں کانوں کے ذریعہ ہر ایک بات اتری جارہی تھی،ایسا بھی وقت آیا کہ جو شبہات میرے دل میں تھے،میں نے سوچے اور تھوڑی دیر کے بعد ہی وہاں سے جواب ملا۔وہ وقت مجھے یاد ہے جب میں تھوڑی دیر میں راسخ العقیدہ حنفی ہو گیا۔حضرت اصغر کے پاس سے وہ صاحب چلے گئے تو میں حاضر ہوا اور ماجرا بیان کر کے رونے لگا۔جب کچھ میری بھڑاس نکلی تو میں نے چاہا کہ ان سے بیعت ہونے کی خواہش کروں میرے دل میں یہ خیال آنا تھا کہ انھوں نے باتوں باتوں میں مجھے اپنے پیر طریقت کی طرف متوجہ کیا اور فرمایا تم جو چاہتے ہو وہاں سے دستیاب ہوگا۔‘‘

(ہمایوں، مارچ، 1951، ص، 259)

اصغؔر نے جگؔر کی روحانی اذیت اور دکھے ہوئے دل کو جانا اور حتی الامکان انھیں مدد اور سکون بہم پہنچانے کے اسباب فراہم کیے۔ چنانچہ 1920 میں انھوں نے جگؔر کا اپنی سالی نسیم سے نکاح کروایا اور اپنے پیر شاہ عبدالغنی سے انھیں بیعت کروائی۔ یوں اصغؔر وجگؔر کی یہ ملاقات پہلے شناسائی، تب دوستی، پھر عقیدت اور بالآخر رشتہ داری میں تبدیل ہوگئی۔ رشتہ داری تو ٹوٹتی بدلتی رہی لیکن باہمی عقیدت واحترام کے جذبات وتعلقات کے آبگینے کو کبھی بھی ٹھیس نہ پہنچی۔ جگؔر اکثر کہا کرتے تھے کہ 'میں جو کچھ بھی ہوں وہ اصغؔر صاحب کی فیض صحبت کا اثر ہے۔ انھوں نے اصغؔر کو عقیدت کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے ایک بہت ہی خوبصورت نظم 'نرگس مستانہ' (خطاب بہ حضرت اصغر نوراللہ مرقدہ) لکھی۔ شعلہ طور کا انتساب انھوں نے اصغؔر گونڈوی اور حسن علی خاں کے نام کیا ہے، جنھوں نے اس کی اشاعت کا اہتمام کیا تھا۔ اصغؔر کے نام اس طرح انتساب کیا ہے:

''میں اپنی ان ادبی کاوشوں اور جگر پاروں کو مولائی وآقائی حضرت مولانا اصغر حسین صاحب اصغؔر گونڈوی قبلہ مرحوم ومغفور کے اسم گرامی پر جن کے فیضان توجہ اور برکات تربیت کا نتیجہ وہ سب کچھ ہے جو شعلۂ طور میں حاضر کیا جارہا ہے۔''

جگؔر بچپن سے ذہین تھے، خاندان کا ماحول ادبی تھا اس لیے نو دس برس کی عمر میں شعر کہنے لگے تھے، لیکن تب تک کوئی مکمل غزل نہیں ہو پائی تھی۔ پندرہ سولہ سال کی عمر میں دو چار غزلیں بھیج کر حضرت داغؔ دہلوی سے اصلاح لی مگر یہ سلسلہ قائم نہ رہ سکا۔ لکھتے ہیں:

''میں نے شروع میں استاد داغؔ دہلوی سے رجوع کیا۔ پھر استاد رساؔ رام پوری ہی میرے استاد تھے۔ انھوں نے مجھے منشی امیر اللہ تسلیم کے پاس بھیجا، مگر انھوں نے کوئی اصلاح نہیں دی۔ بعد میں اصغؔر صاحب کی صحبت سے فیضیاب ہوا۔''

(بحوالہ مرآت جگر، عزیز احمد عزیز، نئی دہلی، 2001، ص، 33)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان حضرات میں سے ان کا باضابطہ استاذ کوئی نہیں ہے، بسلسلۂ اصلاح ان بزرگوں سے جگؔر کی راہ ورسم محض برائے نام تھی۔ دراصل انھوں نے شاگردی اختیار کی اپنے وجدان اور ذوق سلیم کی؛ جس بنا پر انھوں نے شاعری میں اپنی جداگانہ راہ اختیار کی، اظہار کا جدت پسند طور اپنایا اور نئے لہجے کے شاعر کہلائے۔

جگرؔ نے نہ تو خود کو زبان کی بندشوں، عروض کی پابندیوں اور محاورہ بندی کے کھیل میں الجھایا، نہ دہلی اور لکھنؤ کی روایتی شاعری کی پیروی کی اور نہ کسی استاذ شاعر کی اتباع کی۔ وہ عمر بھر خوب سے خوب تر کی تلاش اور جدید سے جدید تر کی فکر میں رہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے مصرعوں کی نوک پلک درست کرتے اور اشعار کو ترمیم و تنسیخ اور حذف و اضافہ کے عمل سے گزارتے رہے، نتیجتاً ان کے اشعار محاوروں کی غلطی، الفاظ کی ثقالت، بندش کی سستی، خیال کی یبوست اور اظہار کی بے کیفی جیسے عیوب سے پاک ہیں۔ وہ خود کہتے ہیں:

''میں نے اول کلام کا کچھ زمانہ چھوڑ کر حسن کو قصائی ہندی یا ایرانی عاشق کی طرح عشق کو ذلیل و رسوا صورت میں ہرگز پیش نہیں کیا بلکہ حسن ہو یا عشق، ان کے حقیقی تاثرات و واردات کو تاامکان صحیح صحیح شاعرانہ انداز بیان کے ساتھ نمایاں کر دیا ہے۔'' (بحوالہ داغ جگر اور شعلۂ طور ایک تقابلی جائزہ، ڈاکٹر احمر رفاعی، جاوداں پبلیکیشنز، کراچی، 2004ص، 107)

جگرؔ کا پہلا مجموعہ 'داغ جگر' کے عنوان سے 1922 میں مطبع معارف اعظم گڑھ سے شائع ہوا۔ اس کے کئی برسوں بعد ان کا دوسرا مجموعہ 'شعلۂ طور' نامی پریس لکھنؤ سے 1934 میں زیور طبع سے آراستہ ہوا جس میں 'داغ جگر' کی بیشتر غزلیں بھی شامل کر لی گئیں۔ ان کا تیسرا اور آخری مجموعہ کلام 'آتش گل' 1954 میں پاکستان کوآپریٹیو، ڈھاکہ (پہلے مشرقی پاکستان، اب بنگلہ دیش) سے چھپا، اور پھر کچھ اضافے اور جگرؔ کی نظر ثانی کے بعد 1958 میں اس کا دوسرا ایڈیشن تنویر پریس لکھنؤ سے شائع ہوا جسے ساہتیہ اکیڈمی دہلی نے 1955، 1956 اور 1957 کی بہترین کتاب ہونے کی بنا پر جگرؔ کو پانچ ہزار روپے کے انعام سے نوازا۔ اس مجموعے کے بعد بھی جگرؔ نے غزلیں کہی تھیں جنھیں بعد میں ڈاکٹر محمد اسلام نے 'یادگار جگر' کے نام سے طبع کروایا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جگرؔ مرادآبادی اپنے عہد کے سب سے مقبول شاعر تھے۔ یہ مقبولیت انھیں اپنی متنوع شخصیت، غزل کی سرمستی و سرشاری، بندش کی دلآویزی، رنگ تغزل، نغمہ و ترنم اور جدید اظہار بیان کی بنا پر حاصل ہوئی۔ جگر کے یہاں فلسفیانہ نکات اور مسائل تصوف کی تلاش غیر ناقدانہ سعی ہوگی، البتہ ان کی خام صورتوں کی نشاندہی تمام شاعری کی طرح یہاں بھی کی جاسکتی ہے۔ وہ قومی تحریک، اپنے عہد کے حالات و واقعات اور اہم حادثات مثلاً انگریزوں کے جبر و ظلم، جنگ عظیم کی ہولناکی، ملک کے فسادات، رہنماؤں کی ریاکاری اور سماجی تعصب وغیرہ سے بھی متاثر ہوئے تھے جس کا اظہار انھوں نے اپنے کلام بالخصوص نظمیہ شاعری میں کیا ہے۔ تقسیم وطن کے نتیجے میں مرتب ہونے والے اثرات کا بیان بھی ان کی غزلیہ شاعری

میں متعدد جگہوں پر رمزی، علامتی اور استعاراتی، اورنظمیہ شاعری میں عیاں بلکہ کافی حد تک برہنہ گفتاری کی صورت موجود ہے۔ سو، ہمارے ناقدوں کا یہ کہنا کہ جگر نے سیاست کو شاعری کا موضوع نہیں بنایا، درست نہیں ہے۔

جگر کا حاوی رجحان اوران کے غالب موضوعات دراصل حسن وعشق، ان کے لوازمات، شاعر کے تصورات وتجربات، عاشق ومعشوق کی ذاتی نفسیات اوران کے جذبات واحساسات کا شائستہ اور سلیقہ مند بیان ہے۔ نہیں بھولنا چاہیے کہ جگر کا تصور حسن وعشق نہایت ہی اعلیٰ وارفع ہے اور کیف وبےخودی اور سرمستی وسرشاری کی لہریں ان کی شاعری میں امتیازی شان پیدا کرتی ہیں۔ خارجی مسائل ومیلانات ان کے کلام میں جگہ جگہ نمایاں ہیں، مگر یہ بھی یادرکھنا چاہیے کہ ان کے یہاں گہری داخلیت کے اعلیٰ نمونے کسی طور کم نہیں ہیں۔ گو کہ موضوعاتی اعتبار سے جگر کے شعری گلستان میں حسن وعشق کا غلبہ ہے جس میں عشق کے گہرے ذاتی تجربات اور حسن کے بے حد قریبی مشاہدات پھولوں کے رنگ وبو کی مانند بکھرے ہوئے ہیں، تاہم اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خاندانی اثرات، اصغر گونڈوی کی صحبت اور شاہ عبدالغنی منگلوری کی ارادت کے زیر اثر ان کے یہاں بشکل شاعری نیم متصوفانہ خیالات بھی گاہے بگاہے رقص کناں دکھائی دے جاتے ہیں، جس میں وحدت الوجود، اخلاقیات اور بشر دوستی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ جگر کے یہاں کبھی کبھی حسن حقیقی کی جو جھلک نظر آتی ہے اسے حسن مجازی کا ہی الیوژن سمجھنا چاہیے یا پھر مجاز کے ذریعے حقیقت کو دیکھ پانے کی کوشش۔ خمریات بھی جگر کی شاعری کا اہم اور دلچسپ موضوع ہے لیکن شکایت روزگار، جس کا رونا میر تقی میر سے لے کر فانی بدایونی تک نے رویا ہے؛ کے تعلق سے ان کے یہاں کوئی شعر نہیں ملتا۔

دہلی اور لکھنؤ کی غزلیہ شاعری کی روایت کے انحطاط کے بعد یا یوں کہیے کہ روایتی غزل پر حالی کی سخت تنقید کے بعد اساتذہ کے قائم کیے معیاروں سے بغاوت یا انحراف کیے بغیر غزل کے موضوعات واسالیب اور طرزِ اظہار میں چند تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ مثلاً یہ کہ روایتی عشق اور تصوراتی عاشق ومعشوق کے بجائے تجرباتی سطح کے عشق اور حقیقی عاشق ومعشوق کو جگہ دی گئی، متنوع خیالات بیان کیے جانے لگے اور روزمرہ کی باتوں اور عام مشاہدوں کے اظہار پر زور دیا گیا۔ اس طرح اردو غزل، غزل کے کردار، اس کے موضوعات ومشاہدات اور اظہار بیان میں یکسانیت کے بجائے تنوع آیا، اور غزلیہ شاعری عام لوگوں اور نئے ذہنوں سے زیادہ قریب آئی۔ جگر بھی ایسے ہی غزل گویوں کی صف میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ دیکھیے کہ انھوں نے کلاسیکی معیار اور روایتی الفاظ واصطلاحات برتتے ہوئے بھی غزل کو کس طرح نئے موضوعات اور اسلوب وآہنگ سے سنوارا ہے:

یہ مے خانہ ہے بزم جم نہیں ہے　　یہاں کوئی کسی سے کم نہیں ہے
ہمت جو ہے بلند تو کچھ اس سے کام لے　　ساقی کا انتظار نہ کر ، بڑھ کے جام لے
جگر ان حوادث سے گھبرانہ جانا　　یہی تو ہے دلچسپیوں کا زمانا
جگر بتایئے کچھ حالِ زار خیر تو ہے؟　　یہ کیوں برستی ہیں مایوسیاں نگاہوں سے
اک ایسا راز بھی دل کے نہاں خانے میں ہے　　لطف کچھ اس کا سمجھنے میں نہ سمجھانے میں ہے
آ کہ تجھ بن اس طرح اے دوست گھبراتا ہوں میں　　جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں
فطرتِ عشق لاکھ پتھر ہو　　ایک نہ اک دن پگھل ہی جاتا ہے
ہوش میں رہتا تو کیا جانے کہاں رکھتا قدم　　یہ غنیمت ہے ، مزاجاً عشق دیوانہ بھی ہے
عشقِ لامحدود جب تک رہنما ہوتا نہیں　　زندگی سے زندگی کا حق ادا ہوتا نہیں
کدھر سے برق چمکتی ہے ، دیکھیں اے واعظ　　میں اپنا شیشہ اٹھاتا ہوں ، تو کتاب اٹھا
کبھی شاخ و سبزۂ و برگ پر ، کبھی غنچۂ وگل و خار پر　　میں چمن میں چاہے جہاں رہوں مراحق ہے فصل بہار پر

جگر کی عطا یہ ہے کہ انھوں نے اپنے ماقبل اور معاصرین کے مقابلے میں اردو غزل کو ایک نرالے کیف، انوکھی نغمگی، برتر نشاط اور لطیف انبساط سے ہم آہنگی بخشی ہے، جس میں خارجی مناظر کے رنگ و بو بھی ہیں اور روحانی ترفع کے احساسات بھی۔ ان کی شاعری نظری یا فکری نہیں بلکہ پوری طرح وہبی ہے۔ وہ اپنی شاعری میں کوئی متصوفانہ یا فلسفیانہ نکتہ بیان کرنے بجائے اسے جمالیاتی احساس اور معصوم کیفیات سے آراستہ کر کے خیالات و جذبات کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری جام وصبو کی باتوں، حسن وعشق کی وارداتوں، عاشق ومعشوق کی حکایتوں، شباب کے کیف اور بادۂ حیات کی سرخوشی سے لبریز ہے:

کوئی حد ہی نہیں شاید، محبت کے فسانے میں　　سناتا جارہا ہے، جس کو جتنا یاد ہوتا ہے
تم مری آنکھ سے دیکھو تو یہ دنیائے جمال　　ہائے کیا چیز مرا عشق خداداد بھی ہے
طبیعت شگفتہ مگر کھوئی کھوئی　　ہرانداز دلکش مگر والہانہ

مجرم بنا ہوا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں
میں وہ ہوں تو نے ظالم خود جس کی آرزو کی

قید خانے میں جو بیٹھا ہوں ،یہ ہے تیری خوشی
تو جو کہہ دے تودو ٹکڑے ابھی زنجیر ہے

کُل اتنی حقیقت تھی منصور و انالحق کی
ناچیز سا اک قطرہ دریا کے مقابل تھا

عشق کی حد سے ملتے پھر یہ منظر دیکھتے
کاش حسن یار کو ہم حسن بن کر دیکھتے

محبت کیا ہے تاثیر محبت کس کو کہتے ہیں
ترا مجبور کردینا ، مرامجبور ہوجانا

حسن سے عشق جدا ہے ،نہ جدا حسن سے عشق
کون سی شے ہے جو آغوش در آغوش نہیں

مجھے روک سکتا ہو کہ کوئی تو روکے
کہ چھپ کر نہیں برملا جارہاہوں

یا وہ خفا تھے ہم سے ، یا ہم خفا ہیں ان سے
کل ان کا زمانہ تھا ، آج اپنا زمانہ ہے

جگر کی ابتدائی غزلوں میں کسی حدتک داغ کا رنگ نمایاں ہے،جن میں داغ کی سی شوخی،شرارت،معاملہ بندی،محبوب کا سراپا،لفظوں کی تکراراوردلچسپ انداز بیان سے کام لیا گیا ہے۔ظاہر ہےاس زمانے کی شاعری میں بعد کے زمانے کی سی پختگی نہیں ہے مگر شاعر کے ارتقائی مراحل کو سمجھنے کے لیے اہم ہے۔جگر بالعموم روایتی الفاظ،سادہ خیال اورآسان انداز اختیار کر کے اشعار کو نغمگی اور مخصوص کیفیات میں ڈھالتے ہیں جس سے ان میں دل نشینی،ایک نوع کا بانکپن اور سہل ممتنع کی خوبی پیدا ہوتی ہے۔کبھی کبھی اسی نوع کا بانکپن پیدا کرنے کے لیے وہ محض الگ الگ فقروں کو جمع کر کے بھی خوبصورت اشعار کی شکل دے دیتے ہیں،جیسے:

زہے صورت، زہے معنی،زہے پردہ،زہے جلوہ
بیک لحظہ، بیک ساعت،عیاں ہونا، نہاں ہونا

تغافل ،تجاہل،تبسم، تکلم
یہاں تک تو پہنچے وہ مجبور ہوکر

نیت شب بخیر، اے ساقی
بزم کیا ہے؟ ساغر جم کیا

ستم ہو ، قہر ہو،آفت، بلا ہو
یہ سب کچھ ہو مگر، پھر دلربا ہو

حسن وعشق اور جذبات واحساسات کی ترجمانی کی بنا پر جگر کورومانی شاعر کہنا یقیناً غلط نہیں ہے،لیکن یہ فرق ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ان کی رومانیت اختر شیرانی اور جوش ملیح آبادی کی رومانیت سے قطعاً مختلف ہے۔اختر وجوش کی رومانیت کافی حدتک خیالی اورتصوراتی ہے،یایوں کہیے کہ انھوں نے رومان کوحقیقت بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ان کے برعکس حسرت موہانی

نے حقیقت میں رومان ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے جب کہ جگر نے حقیقت کو ہی رومان بنادیا ہے۔جگر کے یہاں حسن وعشق، عاشق ومعشوق اور جذبات و احساسات ذاتی تجربات اور حقیقت کی زمین سے نمو کرتے ہیں ۔ جیسی جگر کی زندگی رنگین، دلچسپ، پُر کیف اور پُر سوز تھی ویسی ہی ان کی شاعری ہے۔انھوں نے کسی بھی دور میں عوامی تصورات ومشاہدات کو اپنی شاعری کی قبا نہیں پہنائی، بلکہ نجی تجربات اور ذاتی واردات کو اشعار کے رنگ و لے میں تحلیل کیا ہے، بالکل ویسے ہی جیسے میرؔ نے اشعار کی صورت آپ بیتی کو جگ بیتی بنایا تھا اور ذاتی تجربات واحساسات کو عوامی۔

جگر کا تصور عشق اس اعتبار سے جدید ہے کہ ان کے یہاں یاس وقنوطیت، آہ وفغاں اور گریہ وزاری نہیں ہے۔وہ محبوب کے ہر نقش پا کو سجدے نہیں کرتے، نہ اس کی گلی میں جا کر اپنے آپ کو فراموش کر دیتے ہیں بلکہ ان کے یہاں ضبط وتحمل ہے، بردباری ہے۔ان کے یہاں عشق میں وضعداری، خودداری اور احترام نفس کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔سلام و پیام، جذبات کے اظہار اور ہجر و وصال کے بیانیہ کے حدود متعین ہیں۔ جذبات پاکیزہ ہیں، سوقیانہ نہیں۔ہجر نا قابل برداشت عذاب نہیں، وصل ابتذال نہیں۔اور یہ سب اس لیے ہے کہ ان کا عاشق اپنے محبوب سے خیالی یا شاطرانہ نہیں بلکہ سچا عشق کرتا ہے اور صرف چاہنے کی نہیں، چاہے جانے کی بھی خواہش رکھتا ہے۔اس کا عشق یک طرفہ اور غائبانہ نہیں، آمنے سامنے اور برابری کی سطح کا ہے۔جگر کی رسم عاشقی میں بے قرار صرف عشق نہیں، حسن بھی ہے:

حسن ہے اس طرح سرگرم خرام　　عشق کو احساسِ پامالی نہیں
جہاں وہ ہیں وہیں میرا تصور　　جہاں میں ہوں خیالِ یار بھی ہے

عشق اور عاشق کے تصور کی مانند جگر کے یہاں محبوب کا بھی ایک مخصوص تصور ہے۔یا یوں کہیے کہ جگر کی شاعری کا محبوب دراصل جگر کا ہی حقیقی محبوب ہے تو شاید غلط نہ ہوگا۔جگر کا محبوب ستم گر، بے وفا اور بے اعتنا نہیں بلکہ ہمدرد، باوفا اور عاشق کی طرح ہی چاہنے والا ہے۔وہ اپنے عاشق کی والہانہ محبت کا جواب اسی والہانہ پن سے دیتا ہے۔ بلکہ بعض جگہوں پر تو معشوق اپنے رویے اور فرط محبت کی بنا پر اپنے عاشق کا ہی عاشق معلوم ہوتا ہے، ویسے ہی جیسے بعض مقامات پر جگر کی شاعری کا عاشق معشوق کا روپ دھار لیتا ہے۔یقین کیجیے ایسا معشوق/محبوب نہ تو اردو کی روایتی شاعری کا ہے نہ جگر کے ماقبل اور ہمعصر کسی شاعر کا۔اب آپ کو اختیار ہے کہ اردو شاعری میں اس 'عاشق محبوب' کو جگر کی تخلیق کہیے، یا جگر کا اپنے واقعی معشوق کو اردو شاعری میں مرکزی کردار عطا کرنے کی تجدید سے تعبیر کیجیے۔ہوتا یہ آیا ہے کہ غزل کے شعرا عاشق کی ترجمانی کرنے میں ایسے محو رہے ہیں کہ

ان کے ذہن میں کبھی یہ خیال ہی نہیں آیا کہ معشوق بھی انسان ہے، وہ بھی اپنے سینے میں دل رکھتا ہے جس میں محبت پنپتی اور پروان چڑھتی ہے اوراس کے بھی جذبات واحساسات ہوتے ہیں اور یہ کہ معشوق کوصرف چاہے جانے کی ہی نہیں بلکہ چاہنے کی بھی خواہش ہوتی ہے۔معشوق ہمیشہ معشوق ہی نہیں ہوتا، بسا اوقات معشوق عاشق بھی ہوتا ہے۔جگر کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں نہ صرف معشوق کی نفسیات بلکہ اس کے جذبات واحساسات کی بھی ترجمانی کی ہےاوراس سلیقے سے کہ شدت جذبات اوروفور شوق کے باوجود احتیاط واحترام اورعفت کا دامن کبھی چھوٹنے نہیں پاتا۔محبوب کے تعلق سے رشید احمد صدیقی نے بڑی دلچسپ اورنئی بات لکھی ہے کہ ''ہمارے عام شعرا کے محبوب سے دوستی کرنے کی خواہش ہم میں آپ میں مشکل سے پیدا ہوگی۔جگر کے محبوب کو ہر کوئی اپنانا چاہے گا،اردو شاعری کو یہ زاویہ جگر نے دیا۔'' یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

اف وہ کہنا اس کا پھر بانہوں میں بانہیں ڈال کر
میں جگر کے واسطے ہوں اور جگر میرے لیے

جذبِ جنوں نے آج تو گل ہی نیا کھلا دیا
خود وہ گلے لپٹ گئے عشق کا واسطہ دیا

جگرؔ اب تو وہ بھی یہ کہتے ہیں مجھ سے
ترے ناز اٹھانے کو جی چاہتا ہے

محبت اصل حقیقت ہے اس کو کیا کرتے ؟
ہم التجا جو نہ کرتے ، وہ التجا کرتے

الٰہی آگ ہی لگ جائے تاثیرِ محبت کو
وہ آج اپنا بھی غم بادیدۂ پُر آب کہتے ہیں

ہائے ری مجبوریاں ترک محبت کے لیے
مجھ کو سمجھاتے ہیں وہ، اوران کو سمجھاتا ہوں میں

طے منزلیں ہوئی ہیں یوں عشق و آرزو کی
کچھ میں نے جستجو کی ، کچھ اُس نے جستجو کی

کرجاتے ہیں صاف عذرِ کرم
اور پھر پرسشِ ملال بھی ہے

کس قدر حسن بھی مجبورِ کشاکش ہے کہ آہ
منھ چھپائے نہ بنے، سامنے آئے نہ بنے

دل کے معاملات میں ناصح شکست کیا
سوبار حسن پر بھی یہ الزام آگیا

عشق ہی تنہا نہیں شوریدہ سر میرے لیے
حسن بھی بے تاب ہے اورکس قدر میرے لیے

بتاؤ کیا تمھارے دل پہ گزرے
اگر کوئی تمھیں سا بے وفا ہو

حسن وعشق کے بعد جگر کے یہاں خمریات کے موضوع کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔غالباً اس لیے کہ جگر نے شراب کو بھی محبوب کی طرح ہی چاہا اور برتا ہے۔کہنے کی اجازت دیجیے کہ حسن،عشق،شاعری اور شراب سے ہی جگر کی شخصیت تشکیل پاتی

ہے اور ترفع حاصل کرتی ہے۔ بعض اوقات تو ان کے یہاں محبوب اور شراب کا فرق مٹتا ہوا سا محسوس ہوتا ہے۔ دونوں کے لیے یکساں وفور عشق، شدت جذبات، بے پناہ چاہت اور ہجر و وصال جیسی بے قراری و قرار کا انداز ملتا ہے۔ شاید اسی لیے ان کے یہاں شراب کا بیان ایک نوع کی سنجیدگی، شائستگی، احترام اور شدید تجرباتی محسوسات سے معمور ہے۔ رشید احمد صدیقی نے مزے کی بات لکھی ہے کہ ''شراب اور شاعری سے بے نقاب کرنے والی کم کوئی چیز ہوگی، جگر صاحب کو ان دونوں نے جی کھول کر بے نقاب کیا۔ برہنگی کہیں نظر نہ آئی، رکھ رکھاؤ ہر جگہ موجود'' (آتش گل، ص 24) ایک اور جگہ لکھتے ہیں: ''جگر کی شاعری سے شراب کو جتنا نفع پہنچا، اتنا شراب سے جگر کی شاعری کو نہیں پہنچا۔'' اور ایسا ہونا ہی تھا، کہ جگر نے شاعری کی بنیاد شراب پر نہیں رکھی، بلکہ شراب کی بنیاد شاعری پر رکھی ہے۔ جس طرح شاعری جگر کی شخصیت کا لازمی حصہ تھی اسی طرح شراب بھی ایک عمر تک ان کی زندگی کی رفیق رہی ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ جگر کی شاعری میں شراب نہ تو دردؔ کی شاعری کی طرح تصوف کے زیر اثر شرابِ معرفت کا استعارہ ہے، نہ ہی داغؔ دہلوی اور ریاض خیر آبادی کی مانند غیر تجرباتی مشاہدے کا بیانِ محض، اور کسی حد تک سطحیت کا اظہار۔ شراب کا وہ سچا کیف و سرور جو ایک واقعی رند ہی محسوس کر سکتا ہے وہ نہ تو ریاضؔ کی خمریاتی شاعری میں پائی جاتی ہے، نہ داغ کے یہاں موجود ہے، ممکن ہے اس کی وجہ داغؔ و ریاضؔ کا قطرۂ شراب تک کی لذت سے محروم رہنا ہو۔ دراصل جگر کے یہاں شراب بھی عاشق و معشوق اور حسن و عشق جیسی محترم و محبوب ہے اور انھیں کی صورت زندگی، جذبات و احساسات اور فکر و خیالات پر چھائی ہوئی بھی۔ جگر کی رندی میں مصنوعیت، مریضانہ پن اور ہوش ربائی کے بجائے صداقت، سچی محبت اور دلکشی کی فراوانی ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی 1934 میں 'شعلۂ طور' کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

> ''جگر مست ازل ہے اس کا دل سرشار الست ہے، وہ محبت کا متوالا ہے اور عشق حقیقی کا جویا، وہ مجاز کی راہ سے حقیقت کی منزل تک اور بت خانہ کی گلی سے کعبہ کی شاہراہ کو خم خانہ کے بادۂ کیف سے خود فراموش ہو کر بزم ساقی کوثر تک پہنچنا چاہتا ہے۔ جگر سرشار مگر درحقیقت بیدار ہے، اس کی آنکھیں پُر خمار مگر اس کا دل ہشیار ہے اور کیا عجب کہ خود جگر کو بھی اپنے دل کی خبر نہ ہو، اگر ایسا نہ ہو تو اس کے کلام میں اثر نہ ہو۔''
>
> (مقدمہ، شعلۂ طور)

یہ حقیقت ہے کہ بحیثیت رند اور بحالت رندی جگر نے کبھی بھی تہذیب و شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا، کبھی اپنے ہم عصر اور

انگریزی جیسی شائستہ زبان کے استاذ فراقؔ گورکھپوری اور بے حد مہذب خاندان کے چشم و چراغ جوشؔ ملیح آبادی کی طرح شراب کے نشے میں الف ننگی باتیں نہ کیں، یہاں تک کہ انتہائی مدہوشی کی حالت میں بھی تہذیب و شائستگی کی حدود سے باہر قدم نہ رکھا اور زبان پر نا شائستہ یا ناگوار لفظ کو آنے نہ دیا۔ اب چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

رند جو مجھ کو سمجھتے ہیں انھیں ہوش نہیں
میکدہ ساز ہوں میں ، میکدہ بردوش نہیں

رند وہ ہوں کہ غزل بھی مری رندانہ ہے
معنی و لفظ نہیں، بادہ و پیمانہ ہے

تو جگرؔ سے مستوں پر طعن نہ کر اے واعظ
تو غریب کیا جانے مسلکِ شراب اس کا

ہجوم مے اور پھر جناب جگرؔ
پی پلاکر برائیاں توبہ

پینے والے ایک ہی دو، ہوں تو ہوں
مفت سارا میکدہ بدنام ہے

کیا جگرؔ سے آپ بھی واقف نہیں
ایک ہی تو رند مے آشام ہے

پوچھنا کیا کتنی وسعت میرے پیمانے میں ہے
سب الٹ دے ساقیا جتنی بھی مے خانے میں ہے

یہی صہبا، یہی ساغر، یہی پیمانہ ہے
چشمِ ساقی ہے کہ مے خانے کا میخانہ ہے

تنگ میخانہ تھا میں ساقی نے یہ کیا کردیا
پینے والے کہہ اٹھے یا پیرمیخانہ مجھے

اے محتسب، نہ پھینک! میرے محتسب نہ پھینک
ظالم شراب ہے ، ارے ظالم شراب ہے

جگرؔ کی بادہ کشی ان دنوں معاذاللہ
جب آپ دیکھیں گے، غرق شراب دیکھیں گے

اک جام آخری تو پینا ہے اور ساقی
اب دستِ شوق کانپیں، یا پاؤں لڑکھڑائیں

درِ میکدہ اور سجدوں پہ سجدے
جگرؔ! واہ، کیا کفر سامانیاں ہیں

ایک جگہ بیٹھ کے پی لوں، مرا دستور نہیں
میکدہ تنگ بنادوں ، مجھے منظور نہیں

اے رحمتِ تمام میری ہر خطا معاف
میں انتہائے شوق میں گھبرا کے پی گیا

بے کیفیوں کے کیف سے گھبرا کے پی گیا
توبہ کو توڑ تاڑ کے تھرا کے پی گیا

سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے میخانے میں
خلد شیشے میں ہے، فردوس ہے پیمانے میں

جان کر منجملۂ خاصانِ میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

جگر کی شاعری میں جو لوگ تصوف کے ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اسے بہت زیادہ صحیح اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ اس حوالے سے جگر کے یہاں جتنے اشعار ملتے ہیں ان میں تصوف کے فلسفے یا متصوفانہ عقائد کی گہرئی کے بجائے ان خیالات و اصطلاحات کا اعادہ ہے جو اُس وقت کے معاشرے کے تہذیبی عنصر کی صورت مستعمل اور غزل کی شاعری کے تقریباً لازمی اجزا کے طور پر رائج رہے ہیں۔ یہ خیالات غزل کی کائنات میں اس قدر عام ہیں کہ انھیں کسی کے ذاتی فلسفہ سے منسوب کرنے کے بجائے شاعر کی ذہنی کیفیت اور شاعری کا مزاج سمجھنا چاہیے۔ تصوف سے متعلق جگر کے یہاں بیشتر اشعار کا موضوع وحدت الوجود ہے اور کہنے کی ضرورت نہیں کہ اردو شاعری میں یہ موضوع یا اس کا تصور عام طور سے عشق، عاشق اور محبوب کے موضوع اور تصور جیسا ہی عمومیت کا حامل رہا ہے۔ دردؔ اور کسی حد تک اصغرؔ کی طرح ہمارے شاعروں نے اس حوالے سے کوئی فکری یا اجتہادی کارنامہ انجام نہیں دیا، نہ شاعری میں اس کی گہری بصیرتوں کا اظہار کیا ہے۔ سو، کہنا چاہیے کہ صوفیانہ تصورات و اصطلاحات بیشتر شاعروں کے یہاں غزل کی رسمیات کی حیثیت رکھتے ہیں متصوفانہ تعمق نہیں۔ جی چاہے تو جگر کے یہاں اس نوع کے خیالات کے اظہار کو بھی محض برائے تزئین غزل جانیے اور اگر اصرار ہو تو نیم متصوفانہ خیالات کہہ کر اطمینان قلب کر لیجیے۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ جس طرح حسرتؔ موہانی کے یہاں تصوف کا معاملہ محض مزارات کی زیارت اور چند بزرگوں سے عقیدت کے اظہار تک محدود ہے ویسے ہی جگر کا تصورِ تصوف بھی اصغر گونڈوی کی صحبت اور شاہ عبدالغنی منگلوری کی ارادت کے فیض کا پرتو ہے۔ بہر حال اس موضوع کے تعلق سے جگر کے کچھ عمدہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

دیدۂ حق بیں میں کیسا فرق کیسا امتیاز — ایک ہی جلوہ کہیں لیلیٰ کہیں مجنوں ہوا

جب اس رخ پر نور کا جلوہ نظر آیا — کعبہ نظر آیا نہ کلیسا نظر آیا

اللہ اللہ یہ مری ترک وطلب کی وسعتیں — رفتہ رفتہ سامنے حسن تمام آہی گیا

حرم و دیر نظر آتے ہیں سب سر بسجود — جلوہ گر کون مرے شوق جبیں ساز میں ہے

ہر پردۂ ہستی میں جب تو متشکل ہے — حیران ہوں میں، جلوہ پھر کون سا باطل ہے

اک حسن کا دریا ہے اک نور کا طوفاں ہے — اس پیکر خاکی میں یہ کون خراماں ہے

عین ِ ایماں ہے اناالحق کا ترانہ لیکن — ہے یہی کفر اگر دیدۂ منصور نہ ہو

جگر کے موضوعاتِ شاعری میں تصوف کے مقابلے سیاست کو کہیں زیادہ دخل ہے، گوکہ ہمارے ناقدین نے جگر کے

یہاں سیاست کے موضوع کا انکار کیا ہے مگر جگر کے کلیات کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اخیر دور میں نہ صرف سیاست کو دانستہ اپنی شاعری کا موضوع بنا رہے تھے، بلکہ اس موضوع سے متعلق وہ خاصی بصیرت بھی رکھتے تھے۔ اور ایسا کیوں نہ ہو کہ ان کا عہد عالمی اور ملکی سیاسی کشمکش کا زمانہ تھا اور یہ ممکن نہیں کہ کوئی بھی باخبر اور حساس شاعر و ادیب اور فنکار اپنے عہد کے حالات و واقعات اور سماجی و سیاسی فکر و عمل سے کسی طور وابستہ نہ ہو، ان سے متاثر نہ ہو۔ گو کہ جگر حسرتؔ موہانی کی طرح قطعاً سیاسی آدمی نہ تھے لیکن وہ ملک کی سیاسی، سماجی اور معاشی حالات سے اچھی طرح باخبر تھے اور شاعری میں اس کا اظہار انھوں نے حسرتؔ موہانی کے مقابلے میں کہیں زیادہ بہتر اور بکثرت کیا ہے۔

جگر شاہ عبدالغنی منگلوری سے بیعت تھے، تاہم وہ عملی طور پر صوفی قسم کے آدمی نہ تھے۔ البتہ فکری سطح پر وہ عمر بھر مذہب و تصوف سے وابستہ رہے۔ درحقیقت وہ ایک دوست پرور، وفا شعار، خلوص و محبت کے پیکر، منکسر المزاج، آزاد خیال اور حسن پسند انسان تھے۔ 8 جون 1958 کے اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں: ''مزاجاً رند واقع ہوا ہوں، عملاً ایک عمر بے عملی اور بدعملی میں صرف ہو چکی، دین سے ذہنی طور پر ہمیشہ وابستہ رہا۔ حضرت پیر و مرشد سے بیعت ہونے کے بعد پوری زندگی شدت سے متاثر ہوتی رہی۔'' (مکاتیب جگر، دہلی، 1962، ص، 141) شاید اس دینی اور صوفیانہ مزاج کی بنا پر ہی ان کی شخصیت میں ایک نوع کی بے تعصبی اور بے باکی نمایاں عناصر کی حیثیت رکھتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے بڑے بڑے امیروں اور نوابوں کی صحبتوں میں اپنا سر ہمیشہ بلند رکھا اور انگریزوں اور اپنے ملک کے صاحبان اقتدار حاکموں کے سامنے کبھی گردن نہیں جھکائی۔ وہ جتنے صاف دل اور بے باک تھے، اتنی ہی صفائی اور بے باکی سے دل کی باتیں بھی کہتے تھے۔ علی سردار جعفری 1942، 43 کے ایک مشاعرے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''دوسری جنگ عظیم جاری تھی۔ تحریک آزادی اپنے شباب پر تھی۔ اس زمانے میں حفیظ جالندھری برطانوی سرکار کے کسی جنگی پروپیگنڈے کے افسر تھے اور اس مقصد کے لیے اکثر مشاعرے منعقد کرتے رہتے تھے۔... قیصر باغ (لکھنؤ) کی بارہ دری میں ایک ایسا ہی مشاعرہ تھا جس میں یوپی کے انگریز گورنر نے بھی شرکت کی۔.... جب جگر صاحب کی باری آئی تو لوگوں کو یہ توقع تھی کہ وہ کوئی عاشقانہ، رندانہ، والہانہ غزل سنائیں گے۔ لیکن انھوں نے ایک نظر گورنر پر ڈالی، ایک مجمع پر پھر سر کے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور انتہائی دلدوز ترنم میں اپنی نظم ''قحط

بنگال'' شروع کردی:

بنگال کی میں شام و سحر دیکھ رہا ہوں ہر چند کہ ہوں دور مگر دیکھ رہا ہوں
افلاس کی ماری ہوئی مخلوق سرِ راہ بے گور و کفن خاک بسر دیکھ رہا ہوں

پہلے تو مجمع پر ایک سناٹا چھا گیا، پھر جوش وخروش کی لہر دوڑ گئی۔اب جگر صاحب شعر سنا رہے تھے،اور سامعین دیوانہ وار داد دے رہے تھے:

تعمیر کے پردے میں یہ اندازِ حکومت تخریب بعنوان ِدگر دیکھ رہا ہوں
انجامِ ستم اب کوئی دیکھے یا نہ دیکھے میں صاف ان آنکھوں سے مگر دیکھ رہا ہوں
صیاد نے لوٹا تھا عنادل کا نشیمن صیاد کا لٹتے ہوئے گھر دیکھ رہا ہوں
ارباب وطن کو مری جانب سے ہو مژدہ اغیار کو مجبور سفر دیکھ رہا ہوں

یہ آزادی کا ترانہ تھا۔جنگی پروپیگنڈے کا مشاعرہ غارت ہوگیا...گورنر صاحب پیچ وتاب کھاتے ہوئے مشاعرے سے اٹھے اور انداز بے نیازی سے مسکراتے رہے۔ان کی معصوم مسکراہٹ کے سامنے ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ بھی بے بس ہوگیا تھا۔''(بحوالہ جگر مرادآبادی: ایک مطالعہ،مرتبہ ضامن علی خاں،نئی دہلی،1984،ص 63)

انگریزوں کے جانے اور ملک کے آزاد ہونے کے بعد بھی جگر سیاست کی چالوں اور سیاستدانوں کے مکروفریب کو اچھی طرح دیکھ اور سمجھ رہے تھے۔وہ ایک مخلص وطن پرست کی مانند ملک عزیز کو سیاسی،معاشی،اخلاقی اور بھائی چارگی کے اعتبار سے مثالی دیکھنا چاہتے تھے،اور چاہتے تھے کہ ملک میں امن وانصاف اور مساوات ومحبت کی بالا دستی قائم ہو۔اس حوالے سے انھوں نے یوپی کے وزیراعلیٰ کو غالباً 1952 میں ملک،بالخصوص صوبۂ اترپردیش کے نامساعد حالات کے تعلق سے ایک طویل خط تحریر کیا تھا،یہاں اس کے محض چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

''عالی جناب! غالباً آپ کو یاد ہوگا کہ میں ایک ڈپوٹیشن کے سلسلے میں آپ کی خدمت میں باریاب ہو چکا ہوں۔مجھے اپنے چند جملے یاد ہیں نامناسب نہ ہوگا اگر انھیں دہرادوں،میں نے عرض کیا تھا کہ انصاف کرنا حقیقتاً مقصود ہو تو انصاف دور نہیں.....میں بڑی حد تک صورت حال

سے مایوس ہوں، اس حالت میں ضرورت نہ تھی کہ اس قدر بھی عرض کیا جاتا لیکن میں بحیثیت انسان اور بحیثیت شاعر اور زیادہ سکوت کو ایک عمل مجرمانہ محسوس کرنے لگا ہوں۔ صرف ادائے فرض میرا مقصد ہے آپ کو اس طرح کے یقین دلانے کی ضرورت نہیں کہ میں واقعتاً اپنے وطن کو بڑی سے بڑی حد تک عزیز رکھتا ہوں....اس وقت چند خیالات و تاثرات نے پھر مجبور کر دیا کہ انھیں بھی پیش کر دوں شاید آپ ان پر پوری طرح توجہ کریں اور سمجھیں کہ اس طرح نہ صرف یہ کہ آپ کی حکومت رسوائے عالم ہو رہی ہے بلکہ کانگریس کا وقار بھی رفتہ رفتہ زوال پذیر ہوتا جارہا ہے، میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ عام طور پر 'مسلمان' اپنے آپ کو خصوصاً صوبہ یوپی میں ہر طرح سے غیر محفوظ سمجھنے لگے ہیں، حکومتوں کی عدالتوں پر سے ان کا اعتماد اٹھتا چلا جارہا ہے.....مسلمانان بھارت کے یہ احساسات کہ ان کے خون کی کوئی قدر و قیمت ہی نہیں رہ گئی، اور یہ کہ ان کا مسلمان ہونا ہی ان کا سب سے بڑا جرم ہے نہ صرف اکثریت کے لیے قابل شرم و ملامت ہے بلکہ خود حکومت کے لیے بھی۔''

(جگر مرادآبادی: حیات اور شاعری، محمد اسلام، لکھنو، 1866، ص، 63-162)

جگر اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ خارجی حالات و حوادث سے براہ راست متاثر ہونے والے شاعر تھے۔ سو، یقین جانیے کہ جگر کو محض حسن و عشق اور تغزل کا شاعر کہنا ان کی شخصی جہات اور شاعرانہ فکر کو محدود کرنا ہے۔ واقعہ یہ ہے وہ اپنے عہد کے سماجی اتھل پتھل اور سیاسی تبدیلیوں کو اچھی طرح محسوس کر رہے تھے اور ایک حساس شاعر اور سچے محبّ وطن کی مانند اپنی غزلوں میں ان تاریخی دستاویزوں کو رمزی، علامتی اور استعاراتی انداز اور نظموں میں اعلانیہ طور پر بلکہ برہنہ گفتاری کی حد تک ڈھال رہے تھے۔ کانپور، ممبئ، چھپرا، نواکھالی، دہرہ دون اور دہلی وغیرہ میں فسادات اور قتل و غارت گری کی وارداتوں کے حوالے اور ان کا شعری اظہار ان کی سیاسی بصیرت اور ملک و قوم سے ہمدردی کے غماز ہیں۔ یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

حکومت کے مظالم جب سے ان آنکھوں نے دیکھے ہیں — جگر ہم بمبئ کو کوچۂ قاتل سمجھتے ہیں

آنکھیں ابھی کچھ اور بھی ہیں منتظر جگر — چھپرا کی قتل گاہ کا منظر لیے ہوئے

دہلی و دہرہ دون و نواکھالی و بہار　　انساں ہے اور ماتمِ انساں ہے آج کل
تعداد ایک فرقے کی جتنی بھی گھٹ سکے　　کارِ ثواب و کار نمایاں کے آجکل
چشم کشاد جانب رزم گہ وطن مگر　　مقتل ِکانپور ہے لاشئہ بے کفن نگر
کھلا باب زنداں تو کیا اس سے حاصل　　کہ خود زندگی بن گئی قید خانہ
یہی زمیں ترا مسکن ، یہی ترا مدفن　　اسی زمین سے تو مہر وماہ پیدا کر
زمانہ گرم رفتا رترقی ہوتا جاتا ہے　　مگر اک چشم شاعر ہے کہ پُرنم ہوتی جاتی ہے

وطن عزیز کی تقسیم کے بعد جب باشندگان وطن کے درمیان مذہبی بنیادوں پر صف بندیاں شروع ہونے لگیں تو مستقبل کے نتائج کا اندازہ کر کے وہ بے چین ہو اٹھے اور اپنے کرب کا اظہار انھوں نے اس طرح کیا:

خلوص ِشوق، نہ جوشِ عمل، نہ دردِ وطن

جگر دوہرے کردار والے صاحبان اقتدار، بدنیت سیاستدانوں اور دوست نما دشمنوں کو صرف پہچانتے ہی نہیں تھے بلکہ ان کے کارناموں سے واقف تھے اور ان کے سامنے حقیقت کے برملا اظہار کو ضروری سمجھتے تھے۔ یہ اشعار دیکھیے:

ہندوستاں میں خیر سے ان کی کمی نہیں　　لب پر ہیں جو خلوص کا دفتر لیے ہوئے
ظاہر میں اک مجسمۂ امن و آشتی　　باطن میں لاکھ فتنۂ محشر لیے ہوئے
کہتے ہیں بھائی بھائی ہیں اہل وطن تمام　　پھرتے ہیں آستینوں میں خنجر لیے ہوئے

وہ ملک کی جمہوریت، سماجی مساوات، قانونی بالادستی اور مذہب وذات سے بے تعصبی کی بنیاد پر لیڈر بننے والوں اور پھر اقتدار کی کرسیوں تک پہنچنے والوں سے مخاطب ہو کر انھیں بھولا ہوا سبق یاد دلاتے ہیں:

چمن، چمن ہی نہیں جس کے گوشے گوشے میں　　کہیں بہار نہ آئے، کہیں بہار آئے
یہ میکدے کی ، یہ ساقی گری کی ہے توہین　　کوئی ہو جام بکف ، کوئی شرمسار آئے
زبان و دل میں بہم ارتباط ہو ایسا　　کہ جو زبان کہے دل کو اعتبار آئے
خدا کرے کہ یہ دستور سازگار آئے　　جو بے قرار ہیں اب تک ، انھیں قرار آئے

اب ذرا یہ اشعار ملاحظہ فرمایئے اور جگر کی سیاسی بصیرت اور ملک وقوم کی صورت حال اور مزاج واطوار سے ان کی

واقفیت کا اندازہ لگایئے اور حیرت کیجیے کہ یہ تمام اشعار موجودہ صورت حال پر کس طور پوری طرح سے منطبق ہو رہے ہیں:

آجکل میخانے میں تقسیم ہوتے ہیں جگرؔ — زہر کے ساغر شراب زندگی کے نام سے
معاذاللہ اس کی واردات غم معاذاللہ — چمن جس کا وطن ہو اور چمن بیزار ہوجائے
صیاد کی نظر میں وہ نشتر سے کم نہیں — اک لرزشِ خفی جو مرے بال و پر میں ہے
بشکل ناخدا جس میں ہیں ابتک جعفر و صادق — وہ کشتی غرق ہوجائے تو بیڑا پار ہوجائے
اسی اک جرم پر اغیار میں برپا قیامت ہے — کہ ہم بیدار ہیں اور اپنا مستقبل سمجھتے ہیں
ان کا جو کام ہے وہ اہل سیاست جانیں — میر اپیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے
اسی کا ہے نام اگر ترقی ،تو اس ترقی سے باز آئے — کہ خون مخلوق سے خدا کی ،زمیں ہے لالہ زار اب بھی
ہمیں ملا کر بھی خاک وخوں میں ،نہیں ہیں وہ مطمئن ابھی تک — ہماری خاکِ لحد کے ذرے ، ہیں ان کے دامن پہ بار اب بھی

سیاسی علامت کے حوالے سے ان کی وہ غزل خاصی اہم ہے جس کے اشعار ہیں:

فکر جمیل خواب پریشاں ہے آجکل — شاعر نہیں وہ جو غزل خواں ہے آجکل
اس سے تو خودکشی ہی غنیمت ہے اے جگر — وہ مصلحت جو پیشۂ مرداں ہے آجکل

یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ جگر کے یہاں گاہے بگاہے داغؔ ،میرؔ ،دردؔ ،مومنؔ ، غالبؔ اور اقبالؔ کے اثرات دکھائی پڑ جاتے ہیں ، میر اور غالب کی زمین میں ایک آدھ غزلیں بھی کہی ہیں ،لیکن یہ بھی سچ ہے انھوں نے کسی کی تقلید نہیں کی ، تتبع نہیں کیا۔ وہ خود بہت ہی ایمانداری سے لکھتے ہیں:

''ہوسکتا ہے میرے کلام میں کہیں کہیں مومنؔ کا اثر غیر شعوری طور پر موجود ہولیکن واضح رہے کہ میں تقلید کا قائل نہیں البتہ اس کا اعتراف ہے کہ میرے ابتدائی کلام پر داغؔ کا نمایاں اثر موجود ہے غالبؔ کی عظمت وجحت میرے دل میں ہے لیکن مقلدان کا بھی نہیں۔''

(سہ ماہی اردو، جولائی 1955 ص،145)

جگر کو بچپن سے نہ صرف مالی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا بلکہ والدین اور مہربان چچا کے انتقال کے غموں ،عزیز واقارب دوری ، در بدری کے صدمات اور عشق میں ناکامیوں کے باعث شدید ذہنی ، جذباتی اور روحانی اذیتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔ ان اسباب کی بنا پر ان کے کلام میں سوز وگداز پیدا ہوا ،غموں نے الفاظ کو نغمگی عطا کی ، ذاتی تجربات ومشاہدات نے اشعار کی

صورتیں اختیار کیں اور شعری کائنات میں روایت پرستی کے بجائے نجی فکر وخیال کے اظہار کے حوالے سے انفرادیت پسندی کی شان پیدا ہوئی ۔یہی وجہ ہے کہ انھیں اوران کی شاعری کو ہمہ جہت قبول عام حاصل ہوا۔علامہ ماہر القادری جگر کی مقبولیت کا آنکھوں دیکھا مشاہدہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''حضرت جگر کو مقبولیت، عام شہرت، محبوبیت اور عام پسندیدگی حاصل ہے اس کی مثال دنیائے شاعری میں بہت کم ملے گی طوائفوں کے کوٹھے اور ایکٹریسوں کے شبستانوں سے لے کر قصرو ایوان اور مدرسہ اور خانقاہ تک ان کے کلام کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ان کی شاعری ہر طبقہ میں پسند کی جاتی ہے، میں نے بڑے درجہ کے قومی لیڈروں، گورنروں، وزیروں، ہائی کورٹ کے ججوں اور اعلیٰ عہدہ داروں کو جگر کے ساتھ عقیدت سے پیش آتے دیکھا ہے،مشاعروں کی تو وہ جان اور رونق و آبرو ہیں۔''
>
> (حیات جگر،قیسی الفاروقی ،بحوالہ جگر مرادآبادی: حیات اور شاعری،ص،145)

جگر نے تشبیہات واستعارات کی ندرت ،الفاظ کے تکرار وتواتر، زبان وبیان کی لطافت ،بحر کی نغمگی اور سہل ممتنع کی صنعت سے اپنی شاعری کو ایک خاص رنگ وآہنگ عطا کیا ہے۔وہ اپنی شاعری کے لیے کلاسیکی الفاظ واصطلاح کا انتخاب کرتے ہیں اور روزمرہ کی زندگی کے سادہ اور عام تجربات کا بے تکلفانہ اظہار کرتے ہیں۔یہی وہ چیزیں ہیں جو جگر کو اردو شاعری میں ایک امتیاز اور ہم عصر شعرا میں انفرادی مقام کا حامل بناتی ہیں۔دیکھیے علامہ سید سلیمان ندوی نے شعلۂ طور کے مقدمہ میں جگر کی کیسی سچی اور واقعی انفرادیت کی نشاندہی کی ہے:

> ''جگر شاعر ہے مگر کیسا شاعر! تنہا شاعر بلکہ ہمہ شاعران کا طرز ادا، ابنائے زمانہ سے الگ ،لکھنؤ و دہلی دونوں حکومتوں سے آزاد، موزوں الفاظ اور دلکش ترکیبوں کے باوجود بے ساختگی اور آمد سے معمور، ہر تکلف ،تعمق، اور آورد سے پاک ،...جگر کا کمال یہ ہے کہ سادگی اور تکلف کی ہر شان سے بے نیازی کے باوجود اس میں بے حد فطری آرائش اور از خود نمائش حسن ہے،معنوی لحاظ سے جگر جہاں کھڑا ہے تنہا کھڑا ہے۔سرمستی اور سرشاری ،تاثر اور دل فگاری اس کے ہر مصرعہ کی جان ہے۔'' (جگر مرادآبادی: حیات، انتخاب کلام،تبصرہ، دوسرا ایڈیشن،تبسم نظامی،

حیدرآباد، 1947 ص، 97)

جگر نے نظمیں بھی لکھی ہیں، سہرا، رباعی، قطعے اور نعت بھی ان کی شاعری کو پُرثروت بناتے ہیں۔ ان کا مختصر سا فارسی کلام بھی ہے جس میں بالعموم فارسی شعرا کے تتبع کا عکس ملتا ہے۔ کلام کا خاصا حصہ ان کی لاپروائی اور بے فکری کے باعث ضائع بھی ہوا۔ وہ لکھتے ہیں: ''یہ میں فخر سے نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ انتہائی درد کے ساتھ، کہ میری زندگی کا ہر شعبہ سخت پریشان اور کج مج واقع ہوا ہے، خدا جانے کس قدر سرمایۂ کلام ضائع ہوگیا اور کس قدر اغیار نے فائدہ حاصل کیا۔'' (تحریک، اکتوبر، 1962، ص، 31)

انھوں نے فرمائشی شاعری بھی کی اور خالص مشاعروں کے لیے بھی غزلیں لکھی ہیں جن کی نشاندہی انھوں نے خود ہی اپنے مجموعوں اور بیاضوں میں کردی ہے۔ ابتدائی دور کے بعد وہ مشاعروں کے منتظمین سے معاوضے بہر طور وصول کرتے تھے جو مختلف خاندانوں کی کفالت، حاجت مندوں کی روائی، غریبوں کی امداد اور بے کسوں میں خیرات کی صورت صرف ہوتے تھے۔

جگر صاحب کی حیات میں ہی دوبار اخبارات میں ان کے انتقال کی خبریں شائع ہوئیں۔ پہلی بار 1938 میں اور دوسری بار 1958 میں۔ 1939 میں انھوں نے شراب نوشی ہمیشہ کے لیے ترک کردی تھی جس کا سبب وہ توفیق خداوندی کو قرار دیتے تھے:

واعظ نے اور نہ زاہدِ شب زندہ دار نے مجھ کو جگا دیا میرے دل کی پکار نے

1953 میں انھوں نے دنیاوی لغزشوں سے تائب ہوکر حج کیا اور مدینہ منورہ میں آنسوؤں کے ساتھ سرور کائنات کے حضور خوبصورت نعت پیش کی۔ دوران حج سعودی عرب کے بادشاہ شاہ سعود نے ان کی بڑی قدر و منزلت کی اور انھیں شاہی مہمان رکھا۔ یوں جگر کی یہ بات صحیح ثابت ہوئی جو انھوں نے نواب سید شمس الحسن صاحب کو خط میں لکھا تھا: ''شمس صاحب میں بغیر توبہ کے مروں گا نہیں، آپ اطمینان رکھیں۔'' (جامعہ، نومبر 1963، ص، 252) مارچ 1958 میں ان پر پہلی بار دل کا دورہ پڑا، اس کے بعد ان کا باہر آنا جانا تقریباً بند ہوگیا تھا۔ پھر یہ دورے وقفے وقفے سے پڑتے رہے اور بالآخر 9/ستمبر 1960 کو صبح کے وقت وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے:

دل کو سکون، روح کو آرام آگیا　　موت آگئی کہ یار کا پیغام آگیا

کتابیات

ا۔ جگر مرادآبادی، ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری، ساہتیہ اکادمی، دہلی، 1984

۲۔جگر مرادآبادی، (کتابیات) ڈاکٹر امر رفاعی، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، 1991
۳۔جگر: فن اور شخصیت، شارب ردولوی، الہ آباد، 1961
۴۔جگر مرادآبادی، تبسم نظامی، حیدرآباد، (دکن) 1946
۵۔تذکرۂ جگر، محمود علی خاں جامعی، سندھ، پاکستان، 1961
۶۔یادِ جگر، درگا پرشاد شاؔد سلطان پوری، معیار ادب پبلی کیشنز، 1962
۷۔چہرے، شورش کاشمیری، کراچی، پاکستان، 1961
۸۔ہم نفسان رفتہ، رشید احمد صدیقی، آئینہ ادب، لاہور، پاکستان، 1965
۹۔یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ، سید محمد ازہر شاہ قیصر، دیوبند، 1960
۱۰۔کلیاتِ جگر، مرتبہ کرشن کانت، امرتسر، 1977
۱۱۔شعلۂ طور، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، 1943
آتش گل، لکھنؤ، 1958

ooo

رابطہ:
ڈاکٹر ابوبکر عباد
bakarabbad@yahoo.co.in
فون: 9810532735